رسائل و مسائل

تحدید نسل اور تربیت اولاد

سوال : ترجمان القرآن (فروری ۹۸) میں ڈاکٹر تسنیم ابراہیم کے ایک مقالے کا ترجمہ "مسلم ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی: ہمدردی یا سازش" شائع کیا گیا تھا۔ اس پر جامعہ کی ایک طالبہ نے اپنے تفصیلی مکتوب میں بعض نکات اٹھائے۔ ان کا موقف تھا کہ تحدید نسل کی کوششوں کو سازش قرار دینے کے بجائے معاشرتی حقائق کے پس منظر میں غور کیا جائے تو اس کی حقیقی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آبادی میں اضافے کے بجائے موجودہ آبادی کی صلاحیتوں میں اضافے پر توجہ دینا چاہیے۔ بچوں کی تعداد زیادہ ہو تو معیار زندگی' صحت اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے ان کی مناسب دیکھ بھال نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنا کہ مغرب مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خائف ہے کہ وہ دنیا پر کثرت تعداد کی بنا پر غلبہ حاصل کر لیں گے' محل نظر ہے۔ قلت وسائل' غربت اور پسماندگی کی شکار قومیں افرادی قوت کے باوجود وافر وسائل اور معاشی ترقی کے بغیر کیسے غلبہ حاصل کر سکتی ہیں؟ آج غریب آبادیوں میں کثرت اولاد کی وجہ سے جو صورت حال ہے' اگر مولانا مودودی مرحوم بھی خود مشاہدہ کرتے تو اپنی رائے پر نظرثانی کر لیتے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ قیاس' استحسان یا استصلاح کے اصولوں کے تحت اس مسئلے کا ایک ایسا حل ہونا چاہیے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔

جواب : مجھے آپ کا خط پڑھ کر قلبی مسرت ہوئی کہ الحمدللہ ہماری جامعات میں تعلیمی زوال کے اس دور میں بھی بعض ایسی طالبات اور طلبہ موجود ہیں جو فکری تعصب کی جگہ دلائل و براہین کو معیار حق قرار دیتے ہیں۔ ہمارے فرسودہ لادینی نظام تعلیم میں تحقیق و تحلیل کو جس طرح نظرانداز کیا گیا ہے وہ دینی مدارس کی مقلدانہ فکر سے کوئی بہت مختلف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے والے اذہان میں اضافہ فرمائے۔

تحدید نسل' آبادی کی منصوبہ بندی (planned parenthood) کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ اس طرح غیر محدود طور پر بڑھتی ہوئی آبادی کو قابو میں لا کر اس کی صحت' تعلیم و تربیت اور زندگی کے معیار کو بلند کیا

تدریج قلت خطرناک معاشرتی عدم توازن پیدا کر دے گی' ایک عمدہ شاکلہ تو ہے مگر حقائق کو ظاہر نہیں کرتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ طبقے کے نابغہ باصلاحیت اور قائدانہ صفات کے افراد کو وسائل حاصل ہونے کے باوجود کس نے حد سے حد "دو اچھے بچوں" پر قناعت کا حکم دیا ہے۔ وہ کیوں نہیں اپنے وسائل کے لحاظ سے اوسطاً ۸ بچے پیدا کرتے؟ اگر بات محض مفروضے کی ہے تو یہ کیوں فرض کیا جائے کہ نچلے طبقے کی کثرت ملک پر قابض ہو جائے گی۔ یہ کیوں فرض نہ کیا جائے کہ باحیثیت اور زیادہ باصلاحیت افراد جن کے پاس مادی وسائل بھی ہیں' ان کی کثرت ہو تاکہ ایک صحت مند توازن وجود میں آ سکے۔

آخر میں انتہائی اختصار کے ساتھ صرف دو تین نکات خود تحدید نسل کے بارے میں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جس بچے کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہونے کا بنیادی انسانی حق دیا ہے اور جن ماں باپ کو عقد نکاح کے ذریعے اپنے گھر میں ایک دوسرے کا لباس قرار دیتے ہوئے قرآنی استعارے میں کھیتی میں کاشت کا بنیادی حق دیا گیا ہے' انھیں کوئی حکومتی ادارہ کسی طرح قانون کے زور سے اس انسانی حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ تحدید نسل' دراصل بنیادی انسانی حقوق پر ایک ڈاکا ہے اور ریاست کا اپنے فرائض کی ادائیگی سے فرار کا اعلان ہے۔

ثقافتی اور تہذیبی ورثے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر ایک گھر میں حد سے حد "دو بچے ہی اچھے" ہو سکتے ہیں تو اس کے معاشرتی نتائج یہ ہوں گے کہ اگر یہ دو بچے لڑکے ہیں تو ان لڑکوں کی اولاد خالہ اور پھوپھی کی اصطلاحات کو استعمال نہیں کر سکے گی کیونکہ ان کی اولاد صرف چچا یا تایا کی اصطلاحات کو ہی جانے گی۔ اگر یہ دونوں بچیاں ہیں تو ان کی اولاد ماموں اور چچا اور تایا تینوں اصطلاحات سے ناواقف ہو گی۔ اس طرح عملاً تہذیبی اور ثقافتی ورثہ اور رشتوں کا وجود جسے قرآن کریم صلہ رحمی کہتا ہے' عملاً قطع رحمی میں تبدیل ہو جائے گا۔ کیا ایسا مستقبل تابناک' ترقی یافتہ اور مشفق کہا جا سکتا ہے؟

تحدید نسل کے مؤید بڑے طمطراق سے بار بار عزل کی سکوتی اجازت کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے یہ کوئی نئی دریافت اور برہان قاطع ہو۔ بلاشبہ جو انفرادی آزادی ایک حدیث ہمیں فراہم کرتی ہے' اسے قیامت تک کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ لیکن ہماری نگاہ میں عزل کی حلت و حرمت کا تعلق شخصی اور ذاتی آزادی کے مسئلے سے ہے' جب کہ تحدید نسل کی حیثیت ایک ریاستی پالیسی (state policy) کی ہے۔ عقلی اور نقلی حیثیت سے عزل نہ کرنے کے اختیار کو ریاست (state) نہ سلب کر سکتی ہے اور نہ قرآن و سنت کی ریاستی پالیسی (state policy) کو جو کثرت آبادی کی ہے' منسوخ کر سکتی ہے۔ ایسا کرنا مقاصد شریعہ سے متصادم اور عملاً ریاستی تشدد (state terrorism) اور بنیادی انسانی حق سے محروم کرنا ہو گا۔ ظاہر ہے

پیدائش میں وقفے کے فطری طریقے پر عمل کرتا ہے تو آیندہ ۲ سال تک اس کے ہاں عموماً کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ اس کے مقابلے میں ایک اور شخص جس کی شادی ۱۹۹۵ ہی میں ہوئی تھی' ۱۹۹۹ میں ۳ بچوں کا باپ بن جاتا ہے۔ پہلے شخص کی بچی ۱۹۹۹ کے آخر میں اسکول جانے کے قابل ہو جاتی ہے' جب کہ دوسرے شخص کا پہلا بچہ ۱۹۹۹ میں اسکول جانے کے قابل ہوتا ہے۔ اگر دونوں افراد اپنے بچوں کو ایک پرائیویٹ اسکول میں داخل کرانا چاہتے ہیں تو انھیں کم از کم ۱۰ تا ۱۵ ہزار روپے فی بچہ ضرورت پڑتی ہے۔ اس رقم میں درسی کتب' سواری کا خرچہ' یونیفارم' فیس' غرض وہ سب اخراجات شامل ہیں جو ایک بچے کو اعلیٰ معیار پر تعلیم دلانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

گو یہ مثال قیاسی نظر آتی ہے لیکن عملاً یہی شکل آج ہمارے تمام بڑے شہروں میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے اتنی قیاسی بھی نہیں۔ اب اگر جس پاکستانی فرد کی ہم بات کر رہے ہیں وہ فی الواقع نچلے معاشی طبقے سے تعلق رکھتا ہے تو کیا ۵ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر وہ صرف ایک بچے کی صحیح تعلیم و تربیت بھی کر سکے گا؟ گویا تعلیم و تربیت کا تعلق محض آبادی میں کمی یا اس کی تحدید سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق اور بہت سے بنیادی سوالات سے بھی ہے۔ مثلاً تعلیم کا معاشی پہلو' نجی اور سرکاری شعبے میں معیار کا فرق اور ہمارا تصور تعلیم۔ یعنی کیا ہم صرف بیرونی نصاب پڑھے ہوئے بچوں کو تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں یا سرکاری یا نیم سرکاری مدارس میں تعلیم پانے والے بچوں کو بھی تعلیم یافتہ تصور کرتے ہیں۔ گویا ہمارا تعلیم اور رہن سہن کے معیار کا تصور کیا ہے۔ اسی طرح اگر تعلیم کو ایک تجارت بنا دیا گیا ہو' تو وہ لوگ بھی جو صرف ایک ہی "اچھے" بچے کی پیدائش پر خود کو نوبل پرائز کا مستحق سمجھتے ہوں وہ بھی اس کی تعلیم و تربیت تنہا اپنے وسائل سے نہیں کرا سکتے۔

اب چند لمحات کے لیے یہ مان لیجیے کہ بچے کی تعلیم و تربیت کسی نجی یا سرکاری مدرسے میں نہیں ہونی بلکہ خود ماں باپ ہی کو کرنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر صرف ایک یا ۲ بچے ہوں گے تو کیا ماں باپ زیادہ توجہ دے سکیں گے یا اگر ۶ یا ۸ بچے ہوں گے تو توجہ تقسیم ہو جائے گی؟ اس سوال کا جواب محض قیاس سے دینے کے بجائے اگر صرف چند درمیانے یا نچلے طبقے کے خاندانوں کا مطالعہ کر لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بچے کی تربیت ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق اولاد کی تعداد سے نہیں بلکہ والدین کی اپنی افتادِ طبع کے ساتھ ہے۔ اگر والدین خود غرض اور محض اپنی دنیا میں مگن رہنے والے ہوں تو چاہے ان کی اولاد صرف ایک ہو یا ۸' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے افراد موجود ہیں جنھوں نے انتہائی محدود وسائل کے باوجود اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت' زیادہ وسائل والے افراد سے زیادہ بہتر طور پر کی ہے۔ میری اپنی یونی ورسٹی میں کام

کرنے والے ایک ڈرائیور نے جس کے ۸ بچے ہیں نہ صرف اپنے ایک لڑکے کو ایم اے انگلش کرانے کے بعد مقابلے کے امتحان میں بٹھایا بلکہ بقیہ لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی انٹرمیڈیٹ اور بی اے تک تعلیم دلوائی اور ساتھ ہی ان کی تربیت بھی توجہ کے ساتھ کی۔ میرے علم میں ایسے افراد بھی ہیں کہ کثیر مالی وسائل ہونے کے باوجود ایک یا ۲ بچوں کو نہ صحیح تعلیم دلوا سکے اور نہ صحیح تربیت کر سکے۔ گویا معاشی وسائل اور بچوں کی تعداد کو کم رکھنے کا تعلق منطقی طور پر بچے کی تعلیم و تربیت سے زیادہ خود والدین کے اولاد کے ساتھ رویے' تصور حیات اور کامیاب زندگی کے تصور کے ساتھ ہے۔

عملی طور پر جائزہ لیا جائے تو آٹھوں بچے نہ ایک وقت میں (عام حالات میں) ہوتے ہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ لازماً ہر سال باقاعدگی سے ایک بچہ ہو۔ عموماً جب پہلے بچے کی عمر فطری عمل کے نتیجے میں ۲ سال کے لگ بھگ ہو رہی ہو گی تو اس وقت دوسرے بچے کی شروعات ہوں گی۔ اس طرح ۳' ساڑھے تین سال کی عمر سے پہلے بچے کی رسمی تعلیم و تربیت شروع نہ ہو گی۔ اگر والدین اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے اس پہلے بچے کی صحیح تعلیم و تربیت ۳ سال کی عمر سے کریں تو بعد کے آنے والے بچوں کے لیے بھی یہ بچہ خود ایک مثال (role model) بن جاتا ہے اور خود پہلا بچہ نئے آنے والے کے لیے قابل تقلید تعلیمی مثال پیش کرتا ہے۔ اس طرح تربیت کا عمل والدین اور پہلی اولاد میں بٹ جاتا ہے۔ یہ وہ بنیادی مادی حقائق (ground realities) ہیں جن کے لیے کسی کا علوم عمران میں ایم اے یا پی ایچ ڈی ہونا قطعاً شرط نہیں ہے۔ صرف عائلی اور معاشرتی حقائق سے عملی واقفیت کافی ہے۔

اب اختصار سے دیکھیے کہ کیا اسلام انسانی آبادی کے حوالے سے مقداری (quantitative) تصور اختیار کرتا ہے یا معیاری (qualitative) نظریے کو پسند کرتا ہے۔ قرآن کریم نے سورہ نساء میں' انسان کی تخلیق اور رشتہ ازدواج کے حوالے سے "کثرت رجال" کی شکل میں جو اشارہ کیا ہے' اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے' جن میں امت میں کثرت کا ذکر پایا جاتا ہے' تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یہی رجحان ال عمرٰن ۳:۳۸' الفرقان ۲۵:۷۴ اور النحل ۱۶:۷۲ میں نظر آتا ہے۔ ہمیں علم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھنے والی خاتون کو افضل قرار دیا (ابوداؤد' نسائی)۔ حضرت انس ؓ کو دعا دیتے ہوئے دولت اور بچے' دونوں کی کثرت کی دعا فرمائی۔ اسی کثرت افراد کو سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ کے احسان سے تعبیر کیا گیا ہے (۷:۸۶)۔

ان واضح ہدایات کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بہ اصرار کہی جا سکتی ہے کہ قرآن میں معیار (quality) پر بھی زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۰۰) سے واضح ہوتا ہے کہ محض فرزند نہیں بلکہ صالح اولاد کی طلب کی تلقین گئی ہے۔ یہی بات سیدہ مریم کے حوالے سے دعا میں نظر

آتی ہے۔ (آل عمران ۳:۳۶)۔ لیکن تقویٰ، صالحیت اور "بر" کو اہمیت دینے کا یہ مطلب کیسے لیا جا سکتا ہے کہ "صالحیت" اگر ایک بچہ ہو تو ہو گی، ۱۱ بچے ہونے کی شکل میں صرف ۱/۱۱ ہو گی؟ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ایک یا ۲ بچوں کی حد تک تو اپنے بے اندازہ وسائل میں سے کچھ مال، کچھ علم اور کچھ صالحیت دے دیں گے لیکن اگر بچے زیادہ ہوئے تو اللہ کے خزانے میں کمی آ جائے گی۔ یہ مسئلہ کلامی یا ریاضیاتی نہیں، عملی نوعیت کا ہے۔

آخر میں ایک دو مزید مختصر نکات پر غور کر لیا جائے۔ میرے خیال میں یہ کہنا کہ تربیت یا کثرت و قلت اولاد کے حوالے سے زیادہ "تجربی علم" خواتین کا ہی ہو سکتا ہے، ایک مبنی بر جنس تصور ہے۔ قرآن اور مصاحب مص قرآن کی تعلیمات اس مبنی بر جنس تصور سے ارفع ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ امریکی معاشرے اور پاکستانی معاشرے میں معاشی، معاشرتی، تعلیمی، نفسیاتی اور رسوم و رواج غرض ہر لحاظ سے اختلاف پایا جاتا ہے لیکن انسانی فطرت دنیا میں ہر جگہ ایک ہے۔ قرآن و سنت جو فطرت کے مطابق تعلیمات پیش کرتے ہیں، ہر جگہ ان پر یکساں عمل کیا جائے گا۔

یہ سمجھنا بھی قطعاً درست نہیں کہ مولانا مودودی مرحوم کے زمانے میں شاید وہ مسائل نہ ہوں جو آج وجود میں آئے ہیں۔ مولانا کا انتقال ۱۹۷۹ میں ہوا ہے اور اسلام اور ضبط ولادت کی طبع جدید نظرثانی شکل میں ۱۹۶۱ میں ہوئی جو پچھلی صدی کی بات نہیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ جناب مالتھس (Malthus) اور ان کی ذریت کو ان مسائل کا علم نہ تھا جن سے مولانا مودودیؒ واقف تھے تو شاید زیادہ درست ہو۔

یہ خیال کہ بچوں کی کثرت کے ساتھ ان پر توجہ معاشیات کے قانون Law of deminishing return کی پیروی کرتے ہوئے کم ہوتی جاتی ہے، ایک عمدہ قیاس تو ہو سکتا ہے لیکن عمل کی دنیا اس سے بہت مختلف شکل پیش کرتی ہے۔

تبدیلی قیادت کے حوالے سے بھی کئی تصورات پائے جاتے ہیں۔ مولانا مودودی مرحوم سرمایہ دارانہ اور اشتراکی تصورات کا عقلی رد کرتے ہوئے نہ مڈل کلاس کی قیادت کو مانتے ہیں اور نہ مزدور کی بادشاہت کو۔ ان کا تصور قرآن و سنت پر مبنی اہلیت، امانت اور تقویٰ رکھنے والی قیادت کا تصور ہے جس میں معاشی اور طبقاتی کلاس کی کوئی گنجایش نہیں۔ ٹائن بی یا دیگر مغربی مورخین و مفکرین نے متوسط طبقے کی فکری قیادت (leadership of the elite) کے تصور کو یورپ کے پس منظر میں بطور ایک عمرانی قانون کے پیش کیا ہے، جب کہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اگر یہ تصور انقلاب فرانس میں کام کر گیا ہو تو یہ روس میں بھی کامیاب ہو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ روس کا انقلاب دانش ورانہ قیادت کے تصور کی نفی کرتا ہے۔

اس لیے یہ خیال کہ نچلے طبقے کے افراد کی کثرت اور اعلیٰ اور متوسط طبقے کے "ذہین و نابغہ" افراد کی بے

جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک عام فہم مثال سے ہم اسے یوں ظاہر کرسکتے ہیں کہ اگر ایک خاندان جس کی آمدنی ۵ ہزار روپے ماہانہ ہے اور صرف ایک یا ۲ "اچھے" بچوں پر مشتمل ہے تو ان کی تربیت و تعلیم اعلیٰ معیار پر ہو گی۔ اس کے مقابلے میں ایک شخص کی آمدنی ۵ ہزار روپے ماہانہ ہے لیکن ۲ "اچھے" بچوں کی جگہ ۶ "غیر اچھے" بچے ہیں تو ان کی تعلیم و تربیت غیر معیاری ہی ہو گی۔

گفتگو کے آغاز کے لیے ہم سمجھتے ہیں کہ تعلیم و تربیت اور صحت کے علاوہ چند اور پہلوؤں سے بھی تحدید آبادی کے مسئلے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں اور مغربی ممالک کی طرف سے کام کرنے والی سیکڑوں غیر حکومتی تنظیموں (N.G.O's) کے تحدید آبادی کے منصوبوں کو اپنی توجہ و ترجیح کا مرکز بنانے کے حوالے سے یہ غور کرنے کی ضرورت کہ گذشتہ ۱۰ سال کے عرصے میں ان تمام اداروں کو مسلمانوں کی بھلائی' ترقی' تعلیم اور صحت بہتر کرنے کی ضرورت اچانک کیوں لاحق ہو گئی؟ پھر امت مسلمہ کو ترقی یافتہ ممالک کے مقام پر' تحدید آبادی کے ذریعے' پہنچا دینے کا درد کیوں بار بار دل میں اٹھنے لگا؟ میں پورے اطمینان قلب کے ساتھ "سازشی طریقے" کا مخالف ہوں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جس طرح اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں اور سیکڑوں غیر حکومتی تنظیموں (N.G.O's) کو "خالص انسانی ہمدردی" کا دورہ پڑ سکتا ہے' اسی طرح ترقی پذیر ممالک کے باشندوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ معروضی طور پر ان منصوبوں کا جائزہ لیں۔ اور اگر یہ منصوبے ان کے مفاد کے منافی ہوں تو اجتہاد' استحسان اور مصلحہ عام جیسے اہم فقہی اصولوں کی بنیاد پر ان منصوبوں کے حسن و قبح کو ظاہر کریں۔

مجھے اس بات سے بھی پورا اتفاق ہے کہ اگر فقہائے امت نے اور بالخصوص دور جدید میں' مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے' تحدید نسل پر اپنی معرکہ آرا کتاب اسلام اور ضبط ولادت میں اس مغربی تحریک کی مخالفت کی ہے تو یہ مخالفت ہمیں نفس موضوع پر نئے سرے سے تحقیق و گفتگو کرنے سے نہیں روکتی۔ جہاں تک میں سید مودودیؒ کی فکر کو سمجھتا ہوں وہ اپنی کسی بھی رائے کو قطعی اور حتمی نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے نفس مسئلہ پر بھی موصوف کی خواہش کے مطابق اسلامی اصولوں کی روشنی میں بحث ہونی چاہیے۔

بات کو اختصار مین رکھنے کے سبب' میں یہاں صرف مسئلے کے تعلیمی اور تربیتی اور صحت سے متعلقہ پہلو پر چند نکات رکھوں گا۔ یہ واضح رہے کہ بات پاکستان کے حوالے سے ایک ایسے ماحول میں ہو رہی ہے جس میں ایک کم تر متوسط یا معاشی طور پر محدود آمدنی کا شخص اس پوری گفتگو کا مرکز ہے۔

ایک قیاسی مثال سے اس کی وضاحت شاید زیادہ بہتر ہو سکے۔ ۱۹۹۵ میں ایک شخص کی شادی ہوتی ہے' جب کہ اس کی تنخواہ صرف ۵ ہزار روپے ہے۔ وہ ۱۹۹۶ میں ایک بچی کا باپ بن جاتا ہے۔ اگر وہ بچے کی

جو حدیث عزل کرنے کا اختیار دیتی ہے' وہی اس بات کی دلیل بھی ہے کہ عام حالات میں ایسا نہ کرنا ہی مقصود و مطلوب شریعت ہے۔

کچھ حضرات تحدید نسل کی دلیل پر دور کی کوڑی عموماً جاپان سے لاتے ہیں اور وہاں کی معاشی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کا سبب تحدید نسل کی پالیسی کو قرار دیتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ تصویر کے ایک رخ سے آگے بڑھ کر صورت حال کا مجموعی جائزہ بھی لیں اور خاص طور پر تازہ معاشی و معاشرتی جائزوں پر غور کریں تو شاید ان کی رائے میں توازن پیدا ہو سکے۔ تحدید نسل کے نتیجے میں ایک اہم معاشرتی اثر جو جاپان اور چین پر پڑ رہا ہے اس کا جائزہ ۲۱ نومبر ۱۹۹۸ کے اکنامسٹ میں لیا گیا ہے اور جاپان کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ۲۰۲۰ میں ۱۶ فی صد آبادی کی اوسط عمر ۶۰ سال ہو گی اور ۲۰۳۰ تک دوسروں پر انحصار کرنے والے افراد کی شرح (dependency rate) ۴۷ فی صد ہو جائے گی۔ یہ وہ افراد ہوں گے جو اعلیٰ تعلیم و صحت اور دولت سے فیض یاب ہونے کے باوجود اس محبت' تعلق اور احترام سے محروم ہوں گے جو اولاد سے والدین کو' والدین سے اولاد کو ملتا ہے۔ اور یہ اپنے وجود کی بقا کے لیے ریاست کی سرپرستی کے محتاج ہوں گے۔

تحدید نسل بطور ریاستی پالیسی کے مغربی سامراج کی سازش ہو یا نہ ہو' قرآن و سنت کے مزاج و منشا سے بہرصورت متصادم ہے۔ انسانی فطرت سے بغاوت پر مبنی ایسی کسی بھی پالیسی کے نفاذ سے طاغوت اور شیطان کو خوش بھی ہونا چاہیے اور اس کی حمایت بھی کرنی چاہیے۔ امت مسلمہ کے مفاد کے منافی اس تحریک کو آپ اگر سازش قرار نہ بھی دیں تو کم از کم اس کے بارے میں یہ خیال بھی نہ کریں کہ وہ آپ کی خیر خواہی اور امت مسلمہ کو بام عروج پر پہنچانے کے لیے ہے (پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد)۔

ترجمان القرآن کا مطالعہ

ذہنی و علمی افق کو وسیع کرتا ہے

ملی و قومی مسائل پر شعور و آگہی دیتا ہے

دعوت و تربیت کی راہ میں آگے بڑھاتا ہے

ایمان و حکمت سے مالامال کرتا ہے

ترجمان القرآن اپنے تک نہ رکھیے ... دوسروں تک پہنچایئے